Fikr-o-Nasar (Islamabad) 7:6 (1969)

اسلام میں تصوّرِ اخوت و مساوات

نشاط چغتائی ـــــــ ترجمہ: معین الدّین خان

❁ یہ اس انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جسے راولپنڈی میں منعقد ہونے والی ۸ فروری ۱۹۶۸ء کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں ترکی کے نمائندے جناب نشاط چغتائی نے پیش کیا تھا۔ ❁❁❁

دینِ اسلام جسے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبیٰ میں جنّت کی ابدی راحت و مسرت اور اس دنیا میں ذہنی سکون و طمانیت کے لئے انسانیت تک پہنچایا ایک ایسا دین ہے جو خصوصیت سے اخوّت و مساوات پر زور دیتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اخوّت اور غیر مسلموں سے مساوی سلوک اس کے دو بنیادی اُصول ہیں۔

دینِ اسلام کے احکام پر مشتمل ہماری مقدس کتاب قرآن مجید کا خطاب نہ تو کسی ایک قوم کے لئے محدود ہے نہ کسی ایک دَور کے لئے، بلکہ اس کا خطاب بلا امتیاز ہر قوم اور ہر زمانہ سے ہے۔ اور اسی لئے اس میں جو ضابطۂ اخلاق پیش کیا گیا وہ بھی عالم گیر ہے۔

قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو ہر قوم کے ارتقائی سفر کی ہر منزل پر اس کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ ہر شخص جاہل ہو یا عالم، عوام سے متعلق ہو یا خواص سے، کاروباری ہو یا گوشہ نشین، امیر ہو یا غریب، بہرصورت وہ قرآن پاک کی رہنمائی کا محتاج رہے گا۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک جہاں تمام نوعِ انسان کو احکامِ الٰہی کا درس دیتا ہے وہاں انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انھیں صرف ان احکام پر عمل کرنا چاہیئے جو ان کے معاشی و معاشرتی احوال سے ہم آہنگی اور مطابقت رکھتے ہوں[1]

---

[1] ہمارے خیال میں فاضل مقالہ نگار کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کسی مسئلہ کے بارے میں ایک سے زائد حل بتائے ہیں وہاں حالات کے لحاظ سے مناسب حل اختیار کیا جا سکتا ہے، یا جہاں قرآن مجید سکوت اختیار کرتا ہے وہاں حسبِ موقع مناسب کارروائی کی اجازت دیتا ہے۔ (مدیر)

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

قرآن پاک ایک طرف ان معاشروں کی رہنمائی کرتا ہے جو ابھی ارتقا کے بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں اور انہیں وہ رہنما اصول بتاتا ہے جن کی انہیں اپنی ترقی کے لئے بے حد ضرورت ہے، تو دوسری طرف وہ اخلاقی و روحانی ارتقا کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز افراد کے لئے بھی شمعِ ہدایت ہے۔ انسانیت دوستی کے نقطۂ نظر سے اسلام دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو برابری کا درجہ دیتا ہے اور جب تک وہ قانون سے وفاداری اور اپنے محصولات و واجبات کی ادائی کرتے رہیں اسلام ان کو سماجی حقوق سے برابر کا فائدہ اٹھانے کی مکمل اجازت دیتا اور انہیں اپنے مذہبی فرائض بجالانے کی پوری آزادی بخشتا ہے[1]۔

مساوات کا یہی پاکیزہ و اعلیٰ جذبہ تھا جس کے باعث اسلام تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں نے بھی اسے اچھی نظروں سے دیکھا۔ بدقسمتی سے بنو امیہ نے عرب قومیت کی جس حکمتِ عملی کو اپنایا اس نے غیر عرب مسلمانوں میں اپنے حقوق کی مدافعت و تحفظ کے لئے ایسا ردِّ عمل پیدا کر دیا جس کے نتیجہ میں مرکز اور وحدتِ اسلامی کے خلاف بغاوتیں رونما ہوئیں[2]۔ ان کے اس طرزِ عمل سے اسلام کی اشاعت نمایاں طور پر سست پڑ گئی اور اس کی ترقی میں بتدریج کمی ہونے لگی۔ پھر ان خانہ جنگیوں نے جنہیں شخصی غرور و تکبر، ذاتی عداوتیں اور ہوس بھڑکا رہی تھی، اس خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔

اگر اخوت و مساوات کے اسلامی اصولوں پر نیک نیتی سے عمل کیا جاتا تو قبائلی اور قومی عصبیت کے باوجود اسلامی معاشروں کے رشتے مضبوط تر ہو جاتے اور اسلامی مملکتوں کا ایک وفاق تشکیل پذیر ہو جاتا۔ چونکہ علاقائی اور قومی جذبات کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ہمیں ان جذبات کو برقرار رکھتے ہوئے عالمِ اسلام کی وحدت اور ایک مرکز کی تشکیل کے لئے کوشش کرنا چاہئے۔

عین آغازِ اسلام کے زمانہ میں بھی اہلِ مکہ و اہلِ مدینہ، اور انصار و مہاجرین وغیرہ کے درمیان یہ علاقائی تعصبات موجود تھے۔ ایرانی، ترک اور بربر اقوام جداگانہ قومیت کا شعور ایک زمانہ تک بھول گئے تھے لیکن درحقیقت یہ شعور اپنی پوری قوت سے زیرِ زمین مصروفِ عمل رہتا تھا۔

اگرچہ اسلامی معاشروں میں قومیت اور وطنیت پرستی کے جذبات ختم کرنے کے لئے بہت کوششیں کی گئیں لیکن ان سے کبھی بھی کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر دولتِ عثمانیہ کی اندوہناک شکست کے بعد، پرچمِ خلافت کے سائے میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں لیکن یہ بھی ناکام ہو گئیں۔ اس موضوع پر

موسیٰ کاظم نے جو سابق شیوخ الاسلام میں سے تھے، استنبول سے شائع ہونے والے رسالہ "اسلام" میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا۔ جامعہ استنبول کے شعبۂ دینیات میں حدیث کے استاد احمد نعیم نے "اسلام میں قومیت کا مسئلہ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی پر مبنی ہے۔[۲۵]
یہ تمام کوششیں بے حاصل و بے نتیجہ رہیں اور ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ایران نے کئی سال قبل خلافت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا، اور دوسرے مسلم ممالک مثلاً جزیرہ نمائے عرب میں یمن اور حجاز، شمالی افریقہ میں مصر، لیبیا، الجزائر، تیونس اور مراکش یا تو خود سلطنتِ عثمانیہ سے الگ ہو گئے یا انھیں الگ کر لیا گیا۔
بہرحال پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر عراق، شام، اردن اور لبنان جو اسلامی زنجیر کی آخری کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے الگ الگ ہو گئے اور وہ بندھن جو عرصہ دراز سے ایک سوتی دھاگہ کے ذریعہ قائم تھا بالآخر ٹوٹ گیا۔

ان حقائق کے بیان سے میرا مقصد یہ ہے کہ مختلف معاشروں کے درمیان جو زبان، رسم الخط، رسم و رواج، جغرافیہ اور آب و ہوا کے اعتبار سے جدا ہوں، قومی اختلافات سے انکار کرنا اور مسلم اقوام میں قومیت کے جذبات کا لحاظ رکھے بغیر، اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل اور لایعنی ہے۔ اس طریقہ سے بامقصد نتائج پر پہنچنا ناممکن ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صدیوں کے تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے ہمیں زیادہ مثبت اور تعمیری راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ دینِ اسلام کے اصولوں اور احکام پر عمل کیا جائے۔

قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب مسلمان بھائی ہیں، سو تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔" (۴۹: ۱۰)
اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ ہمیں اپنے نبی حضرت محمد صلعم کی زندگی میں پوری قوت و اتحاد کے ساتھ اسلامی اخوت کا مظاہرہ دو موقعوں پر نظر آتا ہے۔ اولاً جب کہ آپؐ ابھی مکہ میں ہی تھے اور قریش کے ایمان لانے والوں نے رشتۂ اخوت قائم کیا، اور اس طرح خود کو اہلِ مکہ کے ظلم و تشدد سے محفوظ رکھا۔
اخوت کا دوسرا بھرپور مظاہرہ وہ ہے جو ہجرت کے بعد انصارِ مدینہ اور مکہ کے مہاجرین کے درمیان قائم ہوا تھا۔ ابنِ ہشام اور ابنِ سعد نے بھائی چارہ کی تفصیل میں جو فہرستیں مرتب کی ہیں ان سے معلوم

ہوتا ہے کہ مہاجرین نے جو اپنا تمام مال و متاع مکہ میں چھوڑ آئے تھے، مدینہ آنے کے بعد کسی کلفت کے بغیر اپنی زندگی کے نئے دور کی ابتدا کر دی تھی۔ اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے مدنی بھائی ان کے لئے قوت و معاونت کا ایک نیا سر چشمہ ہیں۔ (۴۲)

جب اسلام جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں سے نکل کر غیر عرب اقوام میں پھیلا تو اس نے ان اقوام کے نسلی اور قومی جذبات و احساسات کا خاتمہ نہیں کیا، ساتھ ہی اخوت کے وہ جذبات جو ابتدائی دور میں پیدا کئے گئے تھے برقرار نہ رہ سکے۔ چنانچہ بعد میں آنے والی صدیوں میں جب مسیحی اقوام کے ساتھ تعلقات پیدا ہوئے، ہمیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی خاص طور پر گزشتہ پچاس سال میں لالچ اور دغا کے وہ بیج جو مسیحی اقوام نے مسلم اقوام کے درمیان بوئے تھے بڑی تیزی سے بار آور ہو گئے۔ وہ رشتے جو پہلے ہی کمزور تھے بالکل ختم ہو گئے اور ہر مسلم قوم مسیحی اقوام کے سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا شکار ہو گئی۔

مسلم اقوام کا جہالت کی تاریکی میں، اتحاد و عمل سے عاری، تجارت و سرمایہ سے تہی وجود ان اسباب میں سے ایک تھا جو متوقع تباہی کو تیزی سے لانے کا باعث ہوئے۔

اب کیا کِیا جائے؟

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا قومیت، وطنیت اور ثقافتی آزادی کے اس دور میں مسلم اقوام کو خلافت کے پرچم تلے یا کسی دوسری سیاسی و مذہبی تحریک کے نام پر متحد کرنا ناممکن ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ باستثنائے چند اولین خلفاء اسلامی سلطنت میں ہمیشہ ہی خلفاء کی تعداد ایک سے زیادہ رہی ہے خواہ وہ مکہ میں ہوں یا دمشق میں، قاہرہ میں ہوں یا اندلس میں۔

اب کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام کی پیروی کی جائے جو اس نے قرآن پاک میں وحی کے ذریعے دیئے ہیں۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے۔" (۴۹ : ۱۳)

اسی طرح ہمیں اس پیغام پر عمل کرنا چاہیئے جو ہمارے رسولؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا:

"لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے! یاد رکھو عربی کو عجمی پر اور

عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں افضل ترین وہ ہے جو احکام دین کا سب سے زیادہ پابند ہے۔"

اب اسلامی اقوام میں سے ہر ایک کے انفرادی وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد ہر قوم پر لازم ہے کہ دیگر اقوام مسلمہ کے ساتھ بہت قریبی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات قائم کرے۔ جب یہ تعلقات قائم ہو جائیں تو پھر بین الاقوامی اجتماعات میں ہم آہنگی کے ساتھ متفقہ اقدام، فنّی اور ثقافتی طور پر ایک دوسرے کی مدد اور آپس میں وسیع پیمانہ پر تجارت کے قیام جیسے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے مسلم اقوام کے درمیان ثقافت اور سائنس کے میدانوں میں قریبی روابط استوار ہونے چاہئیں۔ سب سے پہلے یونیورسٹیوں کے درمیان ایک تنظیم کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ ثقافتی روابط کے اُصول متعین ہونے چاہئیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور عمرانی علوم کی قسم کے شعبوں میں نصابی وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اساتذہ کے تبادلے اور بڑی تعداد میں وظائف کا انتظام ہونا چاہیئے۔

اسلامی ممالک کے مابین اساتذہ اور طلباء کا یہ تبادلہ انتہائی مفید ہوگا۔ اس طرح وہ روشن خیال لوگ جو دوسرے برادر اسلامی ممالک میں ان کی زبان، میراث، معاشرتی اور اقتصادی حالات معلوم کرنے کے لئے جائیں گے خود اپنے ملک میں مطبوعات و نشریات کے ذریعہ برادر ملک کے لئے ہمدردی و خیر سگالی کے جذبات اور اخلاقی رشتے قائم کرنے میں ممد و معاون ہوں گے۔

دوسری طرف اسلامی ممالک کی حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ باہمدگر اقتصادی اور فنی میدان میں زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔ انھیں اپنی تمام ضروریات آپس میں ایک دوسرے سے تبادلہ کے ذریعہ پوری کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور صرف اسی صورت میں مطلوبہ ساز و سامان دوسرے ممالک سے خریدنا چاہیئے جب کہ وہ کسی اسلامی ملک میں نہ بنتا ہو۔ اسی طرح انہیں ایک مشترکہ بنک قائم کرنا چاہیئے اور یہ کام وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بہت سے مالدار اسلامی ممالک اپنا سرمایہ یورپی اور امریکی بنکوں میں جمع کراتے ہیں جس سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلم ممالک کے دشمن بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان سرمایہ جات کا ایسے بنک میں جمع ہونا جس کی بہت سی شاخیں اسلامی ممالک میں ہوں، ان ممالک کی ترقی کو تیز رفتار کرنے میں ممد ثابت ہوگا اور اس سے نہایت دُور رس اور مؤثر نتائج برآمد ہوں گے۔

بین الاقوامی اجتماعات میں بھی اشتراک عمل ضروری ہے تاکہ انفرادی حقوق اور اصولوں کا

تحفظ کیا جا سکے۔ ہمیں ان امکانات کو بروئے کار لانے کا احساس بڑی تاخیر سے ہوا ہے۔ اگر یہ رشتے پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہی استوار ہو جاتے تو اغلب تھا کہ بہت سے مسلم ممالک نوآبادیاں بننے سے بچ جاتے یا وہ بیرونی استعمار کی غلامی کے جوئے سے بہت پہلے اور آسانی سے نجات حاصل کر لیتے۔

طبی اور سماجی بہبود کے میدان میں ایک ایسی مشترکہ تنظیم کا قیام بھی ضروری ہے جو جنگ، زلزلہ، سیلاب، قحط، خشک سالی یا آتش زنی کی طرح کے آفات نازل ہونے کی صورت میں محفوظ اور مؤثر اعانت فراہم کر سکے۔ ہم میں اپنے ان مسلمان بھائیوں کی فوری مدد کی اہلیت ہونی چاہیئے جن پر کوئی مصیبت آن پڑی ہو۔

یہ باہمی روابط جو ہر ممکن ذریعہ سے قائم ہونے چاہئیں، ایک بار پھر شدت سے ان کی اہمیت واضح اور یقینی احساس گزشتہ عرب اسرائیل جنگ میں ہوا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ موقع پر ہم بہت پیچھے رہ جائیں، ہمیں ان تعلقات کو جلد از جلد قائم کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

حوالہ جات

۱۔ اس کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ دیکھیئے ابن ہشام، مطبوعہ ۱۹۵۵ء مصری ایڈیشن، ج ۱ ص ۵۰۴ الخ۔ اس کے علاوہ رسول اکرمؐ اور نجرانیوں کے درمیان معاہدہ کے لئے دیکھیئے بلاذری کی فتوح البلدان، ۱۹۳۲ء، مصری ایڈیشن، ص ۷۵، الخ، مزید ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد، ۱۹۶۰ء، بیروت ایڈیشن، جلد اوّل، ص ۳۵۷۔

۲۔ امیر علی، دی اسپرٹ آف اسلام، ترکی ترجمہ، استنبول، ۱۳۴۱ھ، ص ۲۲۹۔

۳۔ احمد نعیم، اسلام میں قومیت کا مسئلہ، ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۶ء) استنبول، انھوں نے صحیح بخاری کا ترکی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا اور ۵۹۴ صفحات کے ایک مقدمہ میں علم حدیث کی تشریح کی تھی۔ یہ ترجمہ بعد میں کامل میراث نے مکمل کیا۔

۴۔ مہاجرین اور انصار میں رشتۂ اخوت کے لئے دیکھیئے ابن ہشام مطبوعہ ۱۹۵۵ء، مصری ایڈیشن، جلد اوّل، ص ۵۰۴ الخ، مزید ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد، ۱۹۶۰ء، بیروت ایڈیشن۔ جلد اوّل، ص ۲۳۸۔